ناول آنگن میں سیاسی رجحانات ایک جائزہ

محمد یاسین پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ
محمد الطاف حسین اسسٹنٹ پروفیسر ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ

Abstract:

خدیجہ مستور کا شاہکار ناول ''آنگن'' اردو کے صف اول کے ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس ناول پر انہیں ''آدم جی'' ادبی ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اس ناول کا دورانیہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک کے زمانے پر محیط ہے۔ ناول میں زوال آمادہ تہذیب انحطاط پذیر معاشرہ اور اس صدی کے مشترک ہندوستان کے اقتصادی نظام اور تہذیبی بساط پر ہند کے مسلمان متوسط طبقے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس طرح ناول پورے ہندوستانی سماج کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیتا ہے۔ خدیجہ مستور نے ایک خاندان کو مرکز بنا کر جذباتی رشتوں کے ذریعے گھر سے باہر پھیلی ہوئی وسیع تر زندگی کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ ناول میں برصغیر کی تقسیم سے قبل اور بعد کی معاشی، سیاسی، اخلاقی اور گھریلو زندگی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت سامنے آتی ہے۔ مصنفہ نے ماضی اور حال کو ملا کر ایک وحدت ترتیب دی ہے اور فن کا استعمال یوں کیا ہے کہ زندگی اور فن کا حسین امتزاج جنم لیتا نظر آتا ہے۔ اس لیے خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ایک اہم فنی تخلیق قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد اس ناول کو ٹالسٹائی کے ناول War and Peace سے مشابہ قرار دیا ہے:

> ''دونوں ناولوں میں افراد کی زندگیوں کے بحرانی لمحات کی کہانی بیان کی گئی ہے ''وار اینڈ پیس'' کے کردار، جنگ اور دیگر خارجی حالات کے محض تماشائی نہیں بلکہ ان کے اثرات ان کی داخلی زندگی میں محسوس کئے جا رہے ہیں۔ یہ اثرات اتنے واضح ہیں کہ محبت، نفرت، خلوص کے جذبات پر ان کے سائے چھائے ہوئے ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت آنگن میں بھی ملتی ہے۔ یہاں بھی آزادی کے قبل کے بحرانی لمحات کے اثرات افراد محسوس کر رہے ہیں۔ ان کا عمل اور سوچ بھی خارجی حالات کے تابع نظر آتی ہے۔''(۱)

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا کہنا ہے کہ دونوں ناول اس وجہ سے یکساں ہیں کہ دونوں میں افراد کی نفسیاتی تحلیل کا

منبع وہ خارجی بحران ہے جس کے گرداب میں وہ شروع سے آخر تک گرفتار رہتے ہیں۔

ناول کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں ہندوستان کی عوام اپنی زندگی کی بڑی جدوجہد میں مصروف آزادی کے حصول کے لیے کوشاں ہیں۔عوام کی وفاداریاں بٹ چکی ہیں ایک گروہ صرف آزادی کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے اور دوسرا طبقہ آزادی کو ایک نئے ملک کی تخلیق کی طرف بڑا اقدم تصور کرتا ہے۔ان افراد نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے جدوجہد شروع کر رکھی ہے۔ بڑے چچا کانگرس سے وابستہ ہیں اور اس کے اصولوں کے لیے انہوں نے سارے گھر کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔گھر کے اندر رہنے والے معاشی بحران کا شکار ہیں جبکہ بڑے چچا ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔اور گزرے ہوئے جاگیردرانہ سماج کو یاد کرتے ہیں جب انھیں سب کچھ حاصل تھا۔ بڑے چچا کے برعکس چھوٹے چچا انگریز دشمنی اور مسلم لیگ کی محبت میں اس قدر خوش ہیں کہ اپنے ایک انگریز افسر کا سر پھوڑ کر جیل چلے جاتے ہیں اور بالاخر ان کی زندگی جیل ہی کی نذر ہو جاتی ہے۔اس سیاسی پس منظر کی اوٹ میں پوری زوال پذیر تہذیب جلوہ گر ہے اخلاقی پستی اور مکروہ روایات کی تہذیب کا نمائندہ کردار دادی جان ہیں۔ جو جاگیردارانہ آمریت سے اپنا پیچھا نہیں چھوڑا پائیں۔ناول میں برصغیر میں رہنے والی دو قوموں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو صرف اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا حامی گروہ مذہبی آڑ میں اپنے سیاسی سماجی واقتصادی مسائل کا حل تلاش کر رہا ہے۔دوسرا گروہ آزادی کو ہی بڑی نعمت گردانتا ہے۔اس کے سامنے کوئی منظّم ضابطہ حیات نہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ آزادی کے بعد ہر چیز اپنے مخصوص سانچوں میں ڈھل کر ان کے لیے مسرت کا سبب بنے گی۔ بڑے چچا کا ذہن بھی یہی تصور پیش کرتا ہے۔لیکن جمیل ہندوستان کے ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جنہوں نے نئے ملک کے حصول کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی تھی۔

مصنفہ نے سیاسی کشمکش کی کہانی میں مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے جبکہ سیاسی پس منظر میں کردار کہانی کو اکثر جانب دار بنا دیتے ہیں۔لیکن خدیجہ مستور اس گرداب سے آسانی سے نکل گئی ہیں اور یہ دیکھانے میں کامیاب رہی ہیں کہ غلامی کی زنجیروں کے باوجود لوگ جب معاشرے میں تبدیلی چاہتے ہیں تو عملی طور پر ان کے باطن میں کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں لکھتے ہیں:

> ''آنگن کے کرداروں کا وجود سیاسی وابستگی سے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف پُر خطر خارجی حالات ہیں جنہوں نے انہیں مسائل کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔دوسری جانب ان کا داخلی انتشار و کرب ہے جس نے انہیں یاسیت اور محرومی کے احساس سے دوچار کر رکھا ہے۔اس صورت حال میں ہر کردار کسی خاص آئیڈیل کا خواب دیکھتا ہے۔ چھمی صرف محبت مانگتی ہے۔جمیل اقتصادی خوشحالی

چاہتا ہے لیکن پیچیدہ سیاسی حالات کی دھند میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے ۔ بڑے بچا آزادی مانگتے ہیں خواہ اس کے لیے ان سے وابستہ تمام افراد فنا ہو جائیں ۔ شکیل تعلیم کے لیے روپیہ مانگتا ہے جو اسے نہیں ملتا تو وہ بمبئی بھاگ جاتا ہے اور آخر میں پاکستان میں نمودار ہوتا ہے'' (۲)

اس داخلی و خارجی انتشار کی فضا میں تخلیق پاکستان کی فضا آگے بڑھتی رہتی ہے ۔ اس مشکل اور کٹھن راہ میں سیاسی تبدیلیاں اور اپنا اپنا مستقبل طے کرنے کے مرحلے بھی شامل ہیں ۔

مصنفہ کے ہاں مخصوص بصیرت کا اظہار ہیروئن عالیہ کے طرز عمل سے ہوتا ہے جو عینیت پسند ہے ۔ اس کے برعکس صفدر کا رویہ ہے جو ایک دم مادیت پرست بن جاتا ہے جس سے عالیہ کو دھچکا لگتا ہے یہ دونوں کردار دیگر اہم کرداروں کے گروہ سے جوڑے ہوئے ہیں جو تاریخ و سیاست میں ہمارے جانے پہچانے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ناول خیال انگیز بن جاتا ہے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''آنگن پاکستان میں لکھا گیا تاریخی شعور، فنی بالیدگی اور فکری صلابت کے اعتبار سے کم از کم میرے نزدیک اس موضوع پر سب سے اچھا ناول ہے'' (۳)

''موضوع'' سے ڈاکٹر محمد حسن کی مراد برصغیر کے حوالے سے اس کی سیاسی تاریخ ہے ۔ ناول میں سیاسی صورت حال کو جا بجا بیان کیا گیا ہے ۔

ناول میں فسادات کے خونچکاں واقعات اور آزادی کے بعد متاثرین کے دگرگوں مصائب و مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

''آنگن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدیجہ کو تاریخ اور سیاست پر حیران کن عبور حاصل ہے ۔ انہیں تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے نازک سے نازک نشیب و فراز کا کما حقہ علم ہے مگر اپنے ناول میں انہوں نے یہ علم اگلا نہیں اسے کینوس کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ اس ناول کو خدیجہ مستور نے ہندوستان کے ایک خاص تاریخی عہد کے ایک خاص طبقے کے طرز حیات اور طرز احساس کا پورا پورا نمائندہ بنایا ہے ۔ یہ فسادات کے سولہ سال بعد لکھا گیا ۔ اس ناول میں فن اور موضوع ہم آہنگ ہیں یہ ہم آہنگی تکنیک میں لازمی عنصر ہے ۔ وہ جو بات کہنا چاہتی ہیں فن کے اتنے موثر سانچے میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی اثر پذیر بن جاتی ہے یہی ہم آہنگی ان کی بڑی کامیابی ہے'' (۴)

ان تمام خصوصیات کی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں سے ایک اہم ناول ہے۔

ناول کا مرکزی کردار عالیہ ہے ناول کا آغاز اسی کی بچپن کی یادوں کا سلسلہ ہے۔گڑیوں سے کھیلنے کی عمر اور برصغیر کی مشترکہ تہذیب کا سلسلہ اجاگر ہوتا ہے۔ ہندو چھوت چھات کے حوالے سے سامنے آئے جبکہ عالیہ کے ہاں انسان دوستی کا علم بلند ہوتا ہے:

> ''جب وہ پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی تو خانسامن بوا کے مشورے سے سلیقے والے کھیل کھیلنا شروع کر دیئے تھے۔صحن کے ایک کونے میں گڑیوں کا بڑا سا گھروندا بنایا گیا۔اس گھروندے میں گڑیوں کی شادی ہوتی' دھوم سے برات نکلتی۔ گڑیوں کے بچے پیدا ہوتے آپا سے وصول کی ہوئی ڈھیروں کترنوں سے کپڑے سیئے جاتے' خانسامن بوا شادیوں اور پیدائش پر کھچوریں بنا کر دیتیں۔کبھی کبھی زردہ بھی پکتا۔اس دن کملا' اوشا اور رادھا چھوت نہ مانتیں' وہ سب کھلے خزانے زردہ کھاتیں۔''(۵)

عالیہ تحریک آزادی اور خلافت کی تحریکوں کے زمانے میں ہوش سنبھالتی ہے،عہد جدید میں اس کا شعور پھلتا پھولتا ہے وہ جس خاندان کا حصہ ہے اس کی مثال جاگیرداری کے زوال کی ہے۔بزرگوں کی نسل رسی جل گئی پر بل نہیں گیا کی مثال رکھتی ہے۔لیکن تحریک خلافت کے حوالے سے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔عالیہ کی دادی کے نزدیک چھوٹے چچا کے علاوہ کوئی قابل اعتنا نہیں اور چھوٹے چچا کی خوبی یہ ہے کہ وہ تحریک خلافت کے سلسلے میں ترکی گئے اور مفقود الخبر ہو گئے۔عالیہ کی ماں کے نزدیک جاگیردارانہ غرور شرافت کی شان ہے۔عالیہ کا باپ مظہر اپنے بھانجے صفدر کو اپنے گھر کا فرد بنا لیتا ہے۔لیکن عالیہ کی ماں اس سے نفرت کرتی ہے جس کا جواز وہ عالیہ کو بتاتی ہیں:

> ''ان کی دو داشتائیں تھیں جن کے تین لڑکے تھے۔دادا نے اپنی داشتاؤں کے لئے الگ الگ گھر بنوا رکھے تھے۔انہیں تمہاری دادی کی حویلی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ہاں ان کے بچے حویلی میں آتے جنہیں تمہاری دادی ناموں کے ساتھ حرامی کہہ کر پکارتیں۔ ویسے ان دنوں داشتائیں رکھنا اتنی بری بات نہ سمجھی جاتی' اسی لئے تمہاری دادی یہ سب کچھ برداشت کر لیتیں۔جائز بیوی کی شان اسی طرح دوبالا رہتی۔زمینداری کا سارا کام تمہاری دادی کے سپرد تھا۔دونوں داشتاؤں کے کھانے پینے کا سامان اپنے سامنے تلوا کر بھجوادیا کرتیں۔
>
> تمہاری سلمہ پھوپھی نے چودہ سال کی عمر میں ان کا منہ کالا کر دیا۔تمہاری

دادی نے ایک دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ صفدر کے باپ کا ہاتھ پکڑے سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ اس دن دادی نے سلمہ پھوپھی کو کمرے میں بند کر کے اتنا مارا کہ سارا جسم نیلا ہو گیا

''دوسرے دن انہوں نے صفدر کے باپ دادا کو زمینوں سے نکال دیا اور دو چماروں کو بلا کر حکم دیا کہ انہیں سب کے سامنے جوتے مار کر گاؤں سے نکال دیں۔ اسی دن شام کو نائن نے آ کر بتایا کہ جانے صفدر کے باپ دادا سے کیا قصور ہوا کہ سب کے سامنے جوتے مارے گئے۔ وہ دونوں گاؤں سے چلے گئے۔ اس خبر کو سن کر دادی ایسے رعب سے اٹھیں کہ سب کانپ گئے' مگر تمہاری سلمہ پھوپھی جیتے جی مر گئیں۔ اس قصے کے بعد انہوں نے نہ تو ڈھنگ کے کپڑے پہنے اور نہ بالوں میں کنگھی کی۔ تمہاری دادی انہیں ہر وقت نظروں میں رکھتیں۔''(۶)

صفدر کے والدین گھر سے بھاگ گئے تھے عالیہ کے دادا انہیں قطعاً زندہ نہ چھوڑتے لیکن وہ مظہر کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ لیکن معاشی طور پر انھیں ضرور پریشان رکھا اس صورت حال میں:

''صفدر کی پیدائش پر سلمہ کو دق ہو گئی اور کچھ دن بعد ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔''(۷)

بعض کردار جاگیردارانہ اکڑ اور غرور کے باوجود انگریز سرکار کے آگے آنکھیں بچھاتے دکھائی دیتے اور اپنے آپ کو ان کا فرمانبردار تصور کرتے ہیں عالیہ کی ماں ایسا ہی ایک کردار ہے:

''مجھے مشن سکولوں سے نفرت ہے' میں اسے نہیں پڑھاؤں گا' بے شک جاہل رہے۔''

''یہ تو میں دیکھوں گی کہ جاہل رہے گی یا پڑھے گی' تم کو تو اللہ واسطے کا بیر ہے انگریزوں سے، جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔'' اماں کی آواز میں اس بلا کا طنز تھا کہ ابا کرسی سے اچھل پڑے۔''(۸)

کچھ لوگ ایسے تھے جو تحریک آزادی کے دوران بھی اپنے آپ کو انگریز سرکار سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ وہ انگریز سرکار سے آزادی کا مطالبہ سراسر غلط تصور کرتے تھے۔ بیشتر لوگ جن میں عالیہ کی ماں بھی شامل تھی انگریز سرکار کو پسند کرتے جبکہ جدید تہذیب سے کنارہ کشی اختیار کرتے۔ عورت کی آزادی کے مسئلے پر تو وہ خصوصاً روایت پسندی کا مظاہرہ کرتے۔ تہمینہ کی شادی مظہر اپنے بھانجے صفدر سے کر دینا چاہتے تھے مگر عالیہ کی ماں کو یہ گوارا نہ تھا:

تمہاری بھابھی کہتی ہیں کہ شادی لڑکی کی پسند سے ہونی چاہیے' اس لیے

آپ خاندان کے لڑکوں کو تہمینہ سے ملائیں اور جسے وہ پسند کرے شادی کر دیں اور وہ کہتی ہیں کہ ہم تہمینہ کی شادی میں ضرور آئیں گے۔

یہ خط پڑھ کر اس کی تو جان پھنک گئی تھی مگر اماں سارا دن مسکراتی رہیں۔ وہ بار بار خوش ہو کر کہتی تھیں _____ ''لو بھلا بیچاری بھابھی کو کیا خبر کہ یہاں ایسی رسمیں نہیں ہوتیں۔''(۹)

جاگیردرانہ تہذیب مشینی دور کی وجہ سے ماند پڑ گئی تھی۔ دنیا بدل رہی تھی۔ نئی نسل انسان کے بنیادی حقوق اور جمہوری اداروں سے آشنا ہو چکی تھی۔ سماج آزادی کا خواہاں تھا۔ اس بدلتے ہوئے دور میں اگر کوئی احتجاج نہ کر سکتی تو خودکشی ضرور کر لیتی۔ کسم یہ کام کر چکی تھی اور تہمینہ کرنے والی تھی۔ تہمینہ صفدر کو پسند کرتی تھی جبکہ اس کی شادی جمیل سے کی جا رہی تھی وہ اپنے خوبصورت ہاتھ عالیہ کو دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی:

''ان میں مہندی رچے گی' اسی دن کے لیے تو میں نے مہندی کے ذرا سے پودے کو سینچا تھا' اب وہ کتنا بڑا ہو گیا ہے' جی چاہتا ہے کہ اس کے سائے میں پڑ کر سو رہوں۔ یہ مہندی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے' اس سے سہاگ کی مہک آتی ہے' محبت کی ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ اس کی سرخی سے تمناؤں کے خون کا پتہ چلتا ہے۔''(۱۰)

آدرش کے تقاضے یا ممانی کی بدسلوکی کی وجہ سے صفدر کمیونسٹ پارٹی میں چلا گیا۔ وہ انڈر گراؤنڈ ایک انقلابی کی زندگی گزار رہا تھا۔ تاہم وہ غم کائنات کے ساتھ ساتھ غم ذات سے بے خبر نہیں ہوا تھا تہمینہ کی شادی جمیل سے طے ہو جانے پر اس نے اپنی ممانی کو لکھا:

''چچی' تہمینہ کی شادی مبارک ہو' آپ اسے کسی کا بھی بنا دیں پھر بھی وہ میری رہے گی۔ وہ صرف میری ہے'' _____ آپا کے چہرے پر ایسا سکون تھا جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی ہو' اس نے جلدی سے خط پھاڑ کر کر چیاں چولھے میں ڈال دیں۔''(۱۱)

مسلم لیگ تقسیم ہند اور کانگرس قومی آزادی کی بات کرتی ہے۔ جبکہ کمیونسٹ پارٹی کا تعلق سماجی انقلاب، سیاسی و اقتصادی آزادی سے تھا۔ جوشیلے نوجوانوں نے کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ پارٹی خلاف قانون ہونے کی وجہ سے پارٹی ممبر روپوشی میں اپنا فرض ادا کرتے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کو یہ کام بڑا پراسرار لگتا تھا۔ چھمی جیسی سادہ لوح لڑکی کا روپوشی کے متعلق تصور بڑا دلچسپ تھا:

''.....وہ کلو کی ماں کا لڑکا تھا نا، وہ مزدوروں کی کسی جماعت میں چلا گیا۔
وہ جماعت انڈر گراؤنڈ رہتی ہے۔اللہ! وہ زمین کے اندر کیسے رہتے ہوں گے؟''(۱۲)

صفدر بھی کامریڈ تھا اور اس جیسے ہزاروں نوجوان، بے روزگاری، سماجی ناانصافی، بھوک اور بیماری کا شکار تھے۔اس لیے وہ آزادی وانقلاب کے راستے پر جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار تھے۔

ہندوستانی عوام بیدار ہو چکی تھی بچے بچے کی زبان پر آزادی کا نعرہ گونج رہا تھا۔البتہ ایک گروہ ہنوز ایسا تھا جو آزادی سے لاتعلق تھا۔کولھو کی بیل کی مانند وہ اپنے مالک کا فرمانبردار تھا۔بڑے چچا کے گھر میں بوا کریمن ایک ایسا ہی کردار تھی۔بوا کریمن کی ماں عالیہ کی دادی کے جہیز میں آئی تھی۔جب یہ جوان ہوئی تو گھر کی مالکن نے اس کی شادی ایک نوکر سے کر دی۔نئی نئی شادی کی وجہ سے مالکن کی خدمت میں کچھ کمی ہوئی۔اس جرم کی پاداش میں مالکن نے کمر پر جو کوڑے برسائے اس کے نشان بڑھاپے میں بھی باقی تھے۔مالکو کا ظلم رعیت کے دل میں عقیدت بڑھاتا ہے کیونکہ راسخ العقیدہ غلام اپنے دل میں یہی تصور کرتے ہیں۔یہ دنیا وآخرت میں آقاؤں کی اجارہ داری تسلیم کرتے ہیں۔ مرتے وقت بھی ان کے دل میں خیال ہوتا ہے کہ ان کا مالک یا مالکن ان سے ناراض تو نہیں۔اگر ایسا ہوا تو وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔یہ احساس صدیوں پرانا ہونے کے باوجود ابھی تک غلام اسی لکیر کے فقیر ہیں:

''میں نے ساری زندگی ان کا نمک کھایا تھا اور اب ان کی اولاد کا نمک کھا
رہی ہوں۔نمک کا بڑا حق ہوتا ہے بٹیا عالیہ' میری اماں' اللہ انہیں جنت نصیب کرے'
کہتی تھیں کہ جس نے نمک کا حق نہ ادا کیا وہ خدا کے ہاں بھی معاف نہ کیا جائے گا۔
مالکن کوئی غلطی ہوگئی تو معاف کر دینا مجھے دوسری دنیا میں تو سکھ کا سانس لے سکوں
_____''(۱۳)

عالیہ کے دل میں اکثر خیال آتا کہ کریمن بوا یہ گھر چھوڑ کر بھاگ کیوں نہیں جاتی۔حق نمک اور پھٹے پرانے کپڑوں پر ہی کیوں گزارا کیے جا رہی ہے۔ادھر کریمن بوا کو خاندانی نمک خوار ہونے پر بڑا ناز تھا۔

داشتاؤں کی اولاد بھی اسی زمرے میں آتی ہے اسرار میاں عالیہ کے دادا کی ایک داشتہ میں سے پیدا ہوئے۔ لیکن بھرے گھر میں سوائے بڑے چچا کے کوئی اسے رشتہ دار تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔اس کے باوجود یہ تمام گھر والوں کے دکھ درد محسوس کرتے اور ہر ایک کی جگہ مرنے کو تیار رہتے۔عالیہ حیران تھی کہ اتنے ہنرمند اسرار میاں بچے کھوچے کھانے پر پلنے کی بجائے باغی کیوں نہیں ہو جاتے۔لیکن وہ بھاگے نہیں۔آزادی کے بعد بھی ان کے دل میں یہ خیال تک نہیں آیا۔بڑے چچا کے قتل پر بوا کریمن نے ان پر نحوست کی لہر ثبت کر کے انھیں دھتکار دیا۔

عدم تعاون نے تحریک آزادی میں مزید شدت پیدا کر دی۔عوام الناس سرکاری اداروں سے بائیکاٹ نہ کر سکی

اس لیے دل ہی دل میں بڑی نادم تھی۔ گھٹن کی شکار عوام انگریز افسروں کو دیکھتے ہی تلملانے لگتی۔ لیکن ضبط کرتے اور حسب ضرورت خوشامد بھی کرتے۔ سارے ملازمین ایک جیسے نہیں تھے کچھ انگریز سرکار کے بڑے خیر خواہ تھے جو انگریز کی وفاداری کو تمام رشتوں پر ترجیح دیتے۔ یہ نمکخوار رعیت لٹیروں کے ٹکڑوں پر پلتے اور انہیں ہی اپنا آقا سمجھتے:

''دو تین دن سے ابا سخت مصروف تھے۔ دفتر سے بھی بڑی دیر میں آتے۔ ان کا انگریز افسر معائنے کے لیے آنے والا تھا۔ ابا ہر چیز ٹھیک کرانے کے علاوہ ڈاک بنگلے میں اس کے رہنے کا انتظام بھی کرا رہے تھے۔ آپا کے ہاتھوں کے کڑھے ہوئے کئی میز پوش اور گلدان بھی چپراسی مانگ لے گیا تھا۔.....رات ابا تھکے ہارے واپس آئے تو اس سے کہا تھا_____ ''بیٹی تم رات کے کھانے کا ذرا اچھا انتظام کرا دینا' ایک چھ سات آدمیوں کا کھانا ہوگا بس' صبح وہ معائنے کو آرہا ہے رات ہمارے گھر دعوت ہوگی۔''

''بھئی حد ہے' خالی خولی نفرت کرتے ہو اور خوشامد میں لگے ہو اس کی' ارے مجھ سے کہو میں خود دعوت کا انتظام کردوں گی''_____ آخر اماں ابا کے سامنے بھی نہ چوکیں۔.....کھانا بس تیار ہی تھا کہ چپراسی بوکھلایا ہوا بغیر آواز دیئے گھر میں گھس آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی دور سے بھاگتا ہوا آرہا ہے۔

''بیگم صاحب اپنے بابو جی کو پولیس پکڑ لے گئی' معائنے کے وقت افسر سے جھگڑا ہو گیا اور اپنے بابو جی نے رول سے اس کا سر پھاڑ دیا۔''

''اماں نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرح دیکھا جیسے چاروں اور اندھیرا چھا گیا ہو۔ پھر انہوں نے چیخنا چاہا تو بس منہ کھول کر رہ گئیں۔ دعوت کے سامان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔.....''تو میرے سر چڑھتا ہے!'' اس نے چپراسی کو مارنے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ ''میں تو بٹیا بیبی کا غلام ہوں' آپ کہاں جائیں گی' بابو جی تو تھانے میں ہیں۔'' چپراسی نے صافے کا پلو آنکھوں پر رکھ لیا_____ ''ڈیم پھول کہتا تھا اپنے بابو جی کو' حرام زادہ''_____ چپراسی نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا_____ ''مجھے مل جائیں تو ایک ہزار ایک انگریز صدقے کر کے پھینکوں اپنے بابو جی پر سے' خون چڑھ گیا ہے میری آنکھوں میں' خون!''(۱۴)

ابتداً خلافت کی تحریک آزادی اور آزادی میں کوئی فرق نہ تھا۔ خلافت کے نام پر روایتی طرز احساس رکھنے والے مسلمان جان نہ بھی دیں تو چندہ ضرور دیتے تھے۔ تحریک خلافت میں عالیہ کا چھوٹا چچا لاپتہ ہو چکا تھا۔ عالیہ کی دادی ان کا تذکرہ فخر اور غم کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کرتیں۔

بڑے چچا کا آنگن ہندوستان کی مثال بنا ہوا تھا۔ بڑے چچا کا بڑا لڑکا جمیل اپنے باپ کی جماعت کانگرس کا مخالف تھا۔تحریک پاکستان کے چرچے پر وہ پکا مسلم لیگی ہوگیا۔ بڑے چچا کی بھتیجی چھمی ماں کے مرجانے کی وجہ سے ان کے پاس ہی رہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مسلم لیگی تصور کرتی تھی۔ بڑے چچا کٹر کانگرسی تھے۔اس لیے چھمی انھیں کافر قرار دیتی۔ کیونکہ ان کا تعلق کافروں کی جماعت سے تھا۔اس کے برعکس بڑے چچا کانگرس کے علاوہ کسی اور جماعت کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے:

''تھوڑے دنوں میں عالیہ کو گھر کے سارے حالات معلوم ہو گئے۔ بڑے چچا نے جاگیر بیچنے کے بعد کپڑے کی دو بڑی بڑی دکانیں کھول لی تھیں جن کی نگرانی کسی زمانے میں وہ خود کرتے تھے۔انہوں نے یہ خوبصورت سا گھر بڑے چاؤ سے بنوایا تھا۔گھر میں مثالی خوشحالی تھی مگر جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے لگے تو دکانیں اسرار میاں کی نگرانی میں لشتم پشتم چلنے لگیں۔ وہ بھی ان کی آمدنی چندوں اور سیاسی ورکروں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کئی بار جیل جا چکے تھے انہیں قید تنہائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی۔ان کے پیروں میں موٹے موٹے سیاہ گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ پاؤں دھوتے ہوئے وہ ان سیاہ گھٹوں کو بڑے فخر اور پیار سے دیکھا کرتے۔ وہ اس قدر کٹر کانگریسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔انہیں تو ان کے مسلمان ہونے پر بھی شبہ رہتا۔کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک کے غدار تھے۔ بڑے چچا اپنی دنیا میں اس قدر مگن رہتے کہ اپنے گھر کی دنیا کو بھول چکے تھے۔اپنی پہلوٹھی کی اکلوتی بیٹی کو ایک معمولی سے لڑکے سے بیاہ دیا تھا۔وہ بھی صرف اس لئے کہ لڑکا کانگریسی تھا' اس وقت سے اب تک ان کی بیٹی چار عدد بچوں کے ساتھ اپنے آنگن میں گوبر تھاپ تھاپ کر زندگی گزار رہی تھی۔ بڑے چچا کو بھلا اتنی فرصت کہاں تھی کہ اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر کرتے یا کوئی کھاتا پیتا گھرانا تلاش کرتے۔ بڑی چچی نے جب بیٹی کی جوانی کی بہت دہائی دی تو انہیں اپنے سیاسی کارکن سے زیادہ بہتر آدمی نظر نہ آیا۔مگر چند ہی دنوں بعد بڑے چچا کو اس بہتر آدمی سے بھی نفرت ہوگئی کیونکہ وہ سیاست سے الگ ہو کر اپنی چند بیگھے زمین اور بیوی بچوں میں کھو گیا تھا۔ بڑے چچا پھر کبھی اپنی بیٹی کے گھر نہ گئے۔ بڑے چچا سے جب گھر کی ضرورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ سرخ پڑ جاتے۔ جانے کیوں جھینپ جھینپ کر سب کی طرف دیکھتے' اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور پھر بڑی امنگ سے سب کو سمجھانا چاہتے۔''جب ملک آزاد ہو جائے گا تو سب تکلیفیں

دور ہو جائیں گی، تم لوگ ذرا گہرائی میں جا کر سا چو۔''

''کہاں تک جائیں گہرائی میں؟'' بڑی چچی کبھی کبھی جھلا اٹھتیں۔(۱۵)

چھمی بڑے چچا کے گھر میں رہ کر بھی ان کی سیاسی حریف تھی۔اس کا باپ ریاست دکن آباد میں بڑے مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ایک بیوی کا خیر باد کہتے تو دوسری کے لیے خوش آمدید کا جذبہ لیے ہوتے۔چھمی کی اس قدر پرواہ تھی کہ ہر مہینے دس روپے بھجوا دیتے۔چھمی کے ابا کو ریاست حیدر آباد کی صورت میں بنا بنایا پاکستان مل گیا تھا۔پس چھمی نے اپنا پاکستان خود تعمیر کرنا تھا۔وہ کپڑے تک نہ بناتی بلکہ سارے کے سارے پیسے پاکستان اور مسلم لیگ کے جلسوں پر قربان کر دیتی۔

ہندوستان کی فضا کچھ ایسی تھی کہ کم وبیش ہر مرد وزن بچہ بوڑھا آزادی کے لیے تڑپ رہا تھا۔البتہ بچوں کے نزدیک کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی فرق نہیں تھا۔کیونکہ دونوں کا مقصد حصول آزادی تھا۔اس لیے بچوں کے نکتہ نظر سے دونوں جماعتیں زندہ باد تھیں۔عدم تعاون اور تحریک پاکستان کی سرگرمیوں کے دوران کانگرس اور مسلم لیگ کے حامیوں میں تصادم ہو جاتا۔بڑے چچا اور چھمی کی انتہا پسندی گاہے بہ گاہے ناخوشگوار صورت حال پیدا کر دیتی لیکن آنگن کا توازن برقرار رہتا۔

''باہر بیٹھک میں بڑے چچا کے کئی مہمان براجمان تھے اور اسرار میاں بیٹھک کے دروازے سے کئی بار سر نکال کر جھانک چکے تھے۔.....وہ اپنے اندھیرے کمرے میں اپنی تک بندی کو لہک لہک کر گانے لگی:۔کاشی میں تلسی بوئی سب بکریاں چر گئیں گاندھی نہرو ماتم کرو کاشی کی میا مر گئیں بڑے چچا ایک دم چونک پڑے ____'' دیکھو اسے منع کر لو، باہر مولانا صاحب وغیرہ بیٹھے ہیں، سب کیا کہیں گے، ساری آواز باہر جائے گی۔'' بڑے چچا غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

''چھمی خدا کے لیے کچھ تو سوچا کر، باہر مہمان بیٹھے ہیں'' ____ بڑی چچی چھمی کے کمرے کی طرف لپکیں۔

''آپ کو کیا، ہم اپنے کمرے میں گا رہے ہیں، یہ کمرہ ہمارا ہے ،جب آپ کے کمرے میں آ کر گائیں تو منع کیجئے گا، باہر سنتے ہوں تو سنیں، ذرا انہیں بھی تو معلوم ہو کہ یہاں سب کافر نہیں رہتے'' ____ وہ بڑے چچا کو چڑانے کے لیے پھر گانے لگی ____ کاشی میں تلسی ____ ''اری جاہل پاگل، میں کچھ بولتا نہیں اور تو آپے سے باہر ہے، اب گا اچھی طرح۔'' بڑے چچا تیزی سے کمرے کی طرف لپکے ____ بیٹھک کا دروازہ بند کر دو شکیل۔'' انہوں نے مڑ کر کہا اور پھر پورے جوش سے

بڑے چچا نے چھمی کے منہ پر کئی تھپڑ جڑ دیئے۔ شکیل دروازہ بند کر کے اس طرح کھڑا تھا جیسے تماشا دیکھ رہا ہو۔

''کاشی میں تلسی بوئی''___ چھمی زور سے چیخی___ ''میں گاؤں گی گا ؤں گی''___ ''چپ!'' بڑے چچا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا۔ بڑی چچی ہا نپ ہانپ کر اپنے شوہر کو الگ ہٹا رہی تھیں اور عالیہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی آنکھیں پھاڑے بڑے چچا کو دیکھ رہی تھی۔ بڑے چچا آج کتنے عجیب طریقے سے اس گھر میں اپنی اہمیت جتا رہے تھے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ان کے سیاسی عقائد کو ٹھیس لگ رہی تھی' اس وقت بڑے چچا اسے سیاسی ڈاکو معلوم ہو رہے تھے۔

'پٹائی ہوئی ہے۔'' شکیل نے جمیل بھیا کی طرف جھک کر کہا۔

''کس کی پٹائی ہوئی ہے؟''

''ارے کچھ بھی نہیں' وہی چھمی' کاشی میں تلسی بوئی' کی رٹ لگا رکھی تھی۔ باہر مہمان بیٹھے تھے' تمہارے ابا نے ایک تھپڑ لگا دیا۔'' بڑی چچی نے بات کو بالکل ہلکا پھلکا بنا کر کہا اور پھر جلدی سے ایک پان گلے میں ٹھونس لیا۔

''مگر آپ نے اسے مارا کیوں' آپ اسے سمجھا سکتے تھے' اس کی بدتمیزی کو روک سکتے تھے' مگر مارنا کہاں کا انصاف ہے' وہ اپنے خیال کا اظہار کرتی ہے تو آپ چڑتے کیوں ہیں۔ جب آپ لوگوں کو نظریے کی آزادی نہیں دیتے تو اپنا ملک کس طرح آزاد کرائیں گے اور اگر آپ کا ملک آزاد بھی ہو گیا تو اس آزادی کو کیسے برقرار رکھیں گے؟'' جمیل بھیا نے بڑے جوش سے ایک ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ ڈالا۔

''صاحبزادے تم گھریلو باتوں کو ملکی معاملات سے مت ٹکرایا کرو اور نہ زیادہ قابلیت جھاڑا کرو' تم کچھ نہیں جانتے۔'' بڑے چچا نے سخت حقارت سے دیکھ کر پھر آنکھیں موند لیں۔

''آپ میری قابلیت کی بات نہ کیا کریں' آپ نے تو مجھے صرف پرائمری تک پڑھا کر گلی ڈنڈا کھیلنے کو چھوڑ دیا تھا اور پھر ملک آزاد کرانے لگے تھے' جیسے میں تو آپ کے ملک کا باشندہ تھا ہی نہیں' جیسے مجھے تو اچھی زندگی گزارنے کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ میں نے بی اے نہیں کیا ہے' لوہے کے چنے چبائے ہیں۔ ذرا آپ یہ تو بتائیں کہ جب آپ کو ایک گھر کا خیال نہیں تو اتنے بڑے ملک کے اتنے بہت سے گھروں کا کس طرح خیال کریں گے۔ یہ بھی خوب رہی کہ ایک گھر کو قربان کر کے دو گھروں کو بچا لو۔''

''لاحول ولا' کیا بے تکی تقریر کر کے دماغ چاٹ رہے ہو' میاں آزادی اور

قربانی کا مفہوم تمہاری سمجھ سے بالا ہے' بس اپنی شاعری کرو اور داد پاؤ' رگ گل سے
بلبل کے پر باندھو اور خوش رہو۔'' بڑے چچا نے کروٹ لے لی۔''(۱۶)

بڑے چچا جاگیر درانہ پس منظر کے باوجود نہایت جدید طرز احساس کے حامل فرد تھے گھر کے سربراہ ہونے کے باوجود ان کی عزت عام آدمی سے بھی کم کی جاتی تھی۔ عالیہ اور بڑی چچی کے علاوہ گھر کے کسی فرد کو بھی ان سے ہمدردی نہ تھی۔ باپ کے جیل جانے کے بعد بڑا بیٹا جمیل مسلم لیگ کے جلسے کرنے لگا۔ بڑی چچی کی حالت نا قابل بیان تھی۔ عالیہ کی پھوپھی نجمہ کے نزدیک تحریک آزادی باعث رسوائی کام تھا۔ جیل جانا ان کے نزدیک شرمندگی کا کام تھا لیکن بڑے چچا ایسے شرمناک کام بار بار کرتے۔ نجمہ کے دونوں بھائیوں کو قید کر لیا گیا تھا انہیں صیاد پر فخر اور صید سے شکایت تھی۔ بہر کیف ایسے موقعہ پرست موجود تھے جن کے خیال میں نہ حاکم غلط تھے نہ ان کا حکم۔ البتہ غلاموں کی طرف سے کیے جانے والا مطالبۂ آزادی ضرور غلط تھا نہ انہیں خون کے رشتوں سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ یہ اپنی پہچان انگریزوں سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔

بہرحال بڑے چچا کو کوئی رنج نہیں تھا کہ ان کے عزیز انگریز سرکار کے خیر خواہ ہیں یا اپنی قوم کے۔ وہ تو آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی تک لگانے کو تیار تھے۔ جیل میں سب شمع آزادی کے پروانے تھے اس لیے انہیں گھر سے زیادہ شاید جیل میں مزا آتا تھا۔ یہ لوگ شخصی سود و زیاں سے بالاتر سوچتے ان کے نزدیک آدرش ہی سب کچھ تھا۔ آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی گولیاں، لاٹھیاں، جیلیں اور پھانسیاں سب کچھ بڑے جوش و خروش سے برداشت ہو رہا تھا کہ آزادی کی صبح نمودار ہوگی اور عہد غلامی کی شب تاریک رات کا خاتمہ ہوگا۔ آزادی کا مفہوم مختلف شخصیتوں اور جماعتوں کا جدا جدا تھا۔ عالیہ کی ماں جیسے کردار انگریز سرکار کے خیر خواہ اور آزادی کا تذکرہ از راہ مذاق کرتے۔ بڑی چچا کا بیٹا شکیل گھر سے بھاگ گیا تھا جس کی جدائی میں وہ آنسو بہاتی۔ چھمی کا تصور آزادی مثبت ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ وہ تذکرہ آزادی انگریزوں کے ٹوڈیوں کو جلانے کی غرض سے کر رہی ہے۔

بڑے چچا کے نزدیک انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر ہٹلر کے خلاف لڑنا انگریزوں کا پٹھو ہونے کے برابر تھا۔ عالیہ غیر جانبدار مبصر تھی کہ اس خیر خواہی کے صلے میں پاکستان بنے گا۔ بڑے چچا کا جذبۂ حریت اسے عزیز تھا اور چھمی کی معصومیت میں خوبصورت پاکستان کی تصویر نظر آتی تھی اس لیے متحدہ ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے عالیہ بڑے چچا کی تائید پر مجبور تھی:

''مجھے ڈر لگتا ہے' یہ لیگی ملک کو بانٹ نہ دیں۔'' بڑے چچا نے دکھ سے کہا
۔''ہاں ڈر تو مجھے بھی ہے۔'' اس نے بڑے چچا کا دل رکھنے کے لیے ہاں میں ہاں
ملائی۔''(۱۷)

آزادی کے تصورات میں بڑا اختلاف تھا۔ متحدہ ہندوستان آزاد ہوگا۔ نہیں نہیں، ہندوستان کی تقسیم ہوگی: پاکستان بنے گا لیکن ایک نکتے پر سب متفق تھے کہ انتقال آبادی نہیں ہوگا جو جہاں رہ رہا ہے وہ وہی آباد رہے گا۔ بسے بسائے گھر ہرگز نہیں اجڑیں گے۔ بڑے یقین کے ساتھ جب جمیل نے بتایا کہ پاکستان بن کے رہے گا۔ وقت آنے پر کسی نے اپنا گھر نہ چھوڑا مسلم لیگ سے گہری وابستگی کا اظہار کرنے والے بھی اپنی جنم بھومی سے جڑے رہے دھن دولت کے لالچ میں آکر جب چھمی کے سسرال نے پاکستان جانا چاہا تو چھمی نے ان کو چھوڑ دیا لیکن آنگن نہیں چھوڑا۔ جمیل بھی یہیں تھا ایک آنگن میں دونوں لیگیوں کی شادی ہوگئی۔ آخر بڑے چچا کو کیا ملا۔ عالیہ کی ماں ان کے گھر پر غاصبانہ قبضہ جمانا چاہتی تھیں۔ عالیہ کی پھوپھی نجمہ نے آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پہلے آزادی سے لطف اندوز ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ہندوستان آزاد ہوگیا۔ مشکل حالات میں بھی بڑے چچا کانگرسی ہونے کے باعث اپنوں سے کافر کا خطاب پاتے رہے لیکن بنیاد پرست ہندوؤں نے گاندگی جی کو نہیں چھوڑا تھا اس لیے وہ بڑے چچا کو قتل کیوں نہ کرتے۔ بڑے چچا کا ایک ہندو نے کام تمام کیا۔ ان کو مسلمان تصور کیا اور قتل کر دیا نہیں تو بڑے چچا عالیہ کی ماں کی سازش کا شکار ہوتے۔ کیونکہ ان کی نظر بڑے چچا کے کاروبار اور مکان پر تھی۔ عالیہ کہ ماں فرسودہ اور زوال آمادہ سماج کی علامت تھی اس لیے عالیہ کا تصور آزادی اپنی ماں کے طرز احساس سے نجات کا طالب تھا۔ عالیہ کا سب سے بڑا دکھ یہ تھا کہ وہ اپنے افکار و احساسات کا اظہار بھی کھلم کھلا نہیں کرسکتی تھی آزادی عمل تو دور کی بات تھی۔ وہ عورت ہونے کے ناطے شدید گھٹن کا شکار تھی۔ پاکستان کا حصول ممکن ہوا۔ عالیہ کے ماموں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے پیش کردیں اور عالیہ کی ماں نے بھائی کے ساتھ پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اب عالیہ کو قابل نفرت سماج کی علامت ماں کے ساتھ سفر کرنا اور رہنا تھا۔ گھٹن کی اس قدر شدت تھی کہ اسرار میاں جیسے آدمی سے ہم کلام ہونا بھی قابل اعتراض تھا۔ کیونکہ اسرار میاں داشتہ کے بطن اور اس کے دادا کے نطفے سے تھے۔ پاکستان کی آزادی ہر روشن خیال عورت کی معاشرتی آزادی تھی۔ متحدہ ہندوستان میں عورت، چار دیواری چادر اور ظالمانہ روایت میں گھری ہوئی تھی۔ عالیہ روزانہ سوشل ورک کے لیے والٹن کے مہاجر کیمپ میں جاتی۔ اور اپنی ماں کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتی کیونکہ پاکستان میں درمیانے طبقے کی تعلیم یافتہ عورت مرد کے ساتھ جمہوری حقوق سے لطف اندوز ہونے لگی۔ عالیہ نے بھی منفی وضع داری کی روایتی زنجیریں توڑ ڈالیں۔

عالیہ کے لیے انفرادی اور سیاسی آزادی ناکافی تھی وہ تو انقلاب چاہتی تھی ایسا انقلاب جو پسے ہوئے طبقات کو زندگی عطا کرے اور ماضی کی ناانصافیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے صفدر کی مثال اس کے سامنے تھی جو نظام جبر کو صبر و استقلال سے بدلنے کی راہ پر چل نکلا تھا۔ عالیہ انقلابی ہونے کی وجہ سے صفدر کو قبول کر رہی تھی لیکن صفدر نے سماج

دشمن علامت عالیہ کی ماں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تو عالیہ کی ماں نے بخوشی ساس بننا قبول کرلیا کیونکہ صفدر نے کہا تھا وہ انقلاب نہیں بلکہ امپورٹ ایکسپورٹ کرے گا۔تو عالیہ نے جرأت انکار سے سر اٹھایا۔

مصنفہ نے ناول میں ہیرو کا کام ہیروئن سے لیا ہے ناول میں صفدر جیسا مرد شکست کھا کر آدرش کی راہ کو ترک کر دیتا ہے لیکن ناول کی ہیروئن عالیہ نے آدرش کا علم گرنے نہیں دیا۔

مصنفہ نے برصغیر کے سیاسی حالات کے حوالے سے دو مضبوط ترین جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بڑے چچا اور چھوٹے چچا دو عام سے گھرانوں کے سربراہان کی زندگیوں کے قصے کو فن کارانہ اور غیر جانبدرانہ انداز سے برتا ہے جو کسی بھی فن کار کے فن کی معراج ہوتی ہے۔اُنہوں نے صحافیوں کی طرح سیاسی بیانات اور ریکارڈ کو بیانیہ اور مکالمے کا حصہ نہیں بننے دیا جس سے فکشن کی روح متاثر ہو۔اُنھوں نے دکھایا ہے کہ بڑے چچا کا کانگرس کے فعال ممبر ہونے کی وجہ سے اُن کے گھرانے کے دیگر افراد پر کیا افتاد آن پڑتی ہے اور چھوٹے چچا کے مسلم لیگی رکن سے اُن کے گھر پر کیا مصیبت گزرتی ہے۔اُن کا فکری ٹکراؤ اپنے ہی گھرانے سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے مستقبل کے اعمال وافعال وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

خدیجہ مستور انسانی مسائل پر غور وفکر اور انسانیت پر پختہ ایمان ہی کی عادت نے انہیں سماجی تناظر میں دیکھنا سکھایا۔اس لیے ان کے کرداروں کا ناطہ دنیا سے جڑا رہا ہے۔یہ دنیا جس میں بسنے والے اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔وہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ مکمل انسان بنتے ہیں۔آنگن کی کی زبان میں اس عہد کے تمام تر انسانی رویے موجود ہیں۔آنگن میں نہ صرف جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا ہے بلکہ تمام تر قومی اور بین الاقوامی مسائل کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔یہی خصوصیت اردو ادب کی تاریخ میں ناول کو منفرد حیثیت بخشتی ہے۔زندگی اور زندگی کے سارے ارتعاشات اور گمھا گھمی آنگن میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۱

۲۔ ایضاً ص ۵۴، ۱۵۳

۳۔ محمد حسن، ڈاکٹر، جدید اردو ادب، غضنفر اکادمی، کراچی، س۔ن، ص ۲۰۰

۴۔ احمد ندیم قاسمی، خدیجہ کی شخصیت اور فن کے رشتے، رسالہ فنون، خدیجہ نمبر، جنوری فروری ۱۹۸۴ء، ص ۶۰

۵۔ خدیجہ مستور، آنگن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۹

۶۔ ایضاً، ص ۱۶، ۱۵

۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۸۔ ایضاً، ص ۲۴، ۲۳

۹۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۵۹، ۵۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۷۰، ۶۹، ۶۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۵، ۸۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۳۵، ۱۳۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۳